Majallah Tahqiq
Research Journal of
the Faculty of Oriental Learning
Vol: 34, Sr.No.93, 2013 pp 45 - 56

مجلہ تحقیق
مجلہ کلیہ علوم شرقیہ
جلد ۳۴، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۳ء، شمارہ ۹۳

ترقی پسند تنقید کے دو اہم معمار

عنبرین انصاری ☆

Abstract:

It is evident that the Progressive Movement in the Sub-continent started in the objective conditions prevailing at that time. In the beginning some men of letters attributed Progressive Criticism to Marxism.But as Dr. Qamar Raees has clarified it was not a mechanical approach towards criticism. The main emphasis is on social context of literature. In this perspective. Two Progressive critics, Syed Sibte Hasan and Zoe Ansari, can be termed as the important founders of Progressive Criticism. Both of them give equal importance to social context of literature as well as the classical and cultural heritage of the society.

اردو میں ترقی پسند تحریک اپنے عہد کے معروضی حالات میں پیدا ہوئی اور اس پر عالمی سیاست اور سماجی تغیرات کے ساتھ ساتھ غالب، سرسید، حالی اور اقبال کے تنقیدی افکار کے بھی اثرات مرتب ہوئے۔ اس میں شک نہیں کہ ''ترقی پسند تنقید'' کی اصطلاح اب کسی مزید وضاحت کی متقاضی نہیں لیکن ڈاکٹر قمر رئیس نے جو ایک زاویۂ نظر اس ضمن میں پیش کیا ہے اس کا جائزہ لینا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> اردو میں مارکسی تنقید، ترقی پسند تنقید اور سماجیاتی تنقید تین اصطلاحیں رائج رہی ہیں اور اکثر تینوں ہم معنی سمجھی جاتی ہیں.... ترقی پسند ادب کی رعایت سے ''ترقی پسند تنقید'' اردو کی اپنی ایجاد ہے اور اسے بین الاقوامی اصطلاح کی سند حاصل نہیں۔[1]

☆ مدیر، مجلہ اسالیب، کراچی

اس اہم نکتے کی وضاحت میں قمر رئیس ''مارکسی تنقید'' اور ''ترقی پسند تنقید'' کے الگ الگ مفاہیم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ مارکسی تنقید اصولوں یا عقائد کا کوئی ایسا مجموعہ یا ایسا نظریہ ہرگز نہیں ہے جس کا اطلاق میکانکی ڈھنگ سے ہر فنِ تخلیق یا ہر دور کے ادب پر ہو سکے۔ اس کے برعکس یہ ایک ایسا متحرک اور لچک دار طریقِ کار (method) ہے جو کسی بھی زبان اور کسی بھی عہد کے مطالعے کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔[۲]

ڈاکٹر قمر رئیس مزید لکھتے ہیں کہ:

> ''مارکسی تنقید'' ادب کو محض سماجی دستاویز کی حیثیت سے نہیں جانچتی۔ مارکس اور اینگلز دونوں نے حقیقت کے ادراک اور اس کے تخلیقی اظہار میں فن کار کی تہہ دار شخصیت اور اس کی دوسری صلاحیتوں کی کارفرمائی کا اعتراف کیا ہے۔ فن کارانہ یا تخلیقی عمل کو وہ ایک وحدت تصور کرتے ہیں اور اسے تخیل یا جذبہ وغیرہ کے خانوں میں تقسیم نہیں کرتے۔[۳]

اس تمام بحث کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ترقی پسند تنقید کی بنیاد مارکسی افکار و خیالات پر رکھی گئی ہے۔ جس میں معروضی اور سائنسی زاویوں سے سماج اور ادب کے رشتوں کو واضح کیا جاتا رہا ہے اور اس سے سماجی انصاف اور انسان دوستی کی اقدار کو فروغ ملتا ہے۔

جیسا کہ ترقی پسند ادب کے جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدا میں چند مارکسی نقادوں، مثلاً اختر حسین رائے پوری، ڈاکٹر عبدالعلیم اور مجنوں گورکھ پوری کے علاوہ متعدد ناقدین نے ''نیا ادب''، ''افادی ادب'' اور ''مصنوعی ادب'' جیسی اصطلاحوں سے کام لیا۔ مرزا یگانہ نے تو اسے ''ادبِ خبیث'' تک لکھ دیا۔ چناں چہ یہ امر فطری تھا کہ ترقی پسند تحریک کی بنیاد رکھنے والے اپنے ادب اور اس کے رموز و علائم کی وضاحت کرتے۔ ان وضاحتی تحریروں میں اچھی خاصی معرکہ آرائیاں بھی

ہوئیں، شدت پسندی کے رخ بھی سامنے آئے لیکن چوں کہ ترقی پسند تحریک معروضیت اور تاریخ کے جدلیاتی عمل پر یقین رکھتی ہے، اس لیے ترقی پسند تنقید کسی جگہ ٹھہر کر منجمد نہیں ہوگئی بلکہ زمانے کے تغیر اور معروضی حالات کے تحت تخلیق، تنقید اور ادب کے دیگر مظاہر کو زمانے کے تقاضوں کے مطابق پرکھتی چلی گئی۔ لہٰذا ترقی پسند تحریک ایک خطِ مستقیم کے بجائے ایک ایسا پہاڑی سلسلہ نظر آتا ہے جس میں اونچی چوٹیاں بھی ہیں اور نیچی گھاٹیاں بھی۔

بلاشبہ ترقی پسند تنقید کے سب معماروں کا اس تحریک کی ساخت پرداخت اور ترسیل و ابلاغ میں اپنا اپنا حصہ ہے اور اپنی اپنی جگہ اُن کے کردار کی بجا طور سے ایک اہمیت ہے۔ تاہم ان معماروں کے مطالعے اور ان کے کام کی قدر و قیمت کے تجزیے میں دو نقاد عموماً تفصیلاً تذکرے میں نہیں آتے۔ وہ دو نقاد ہیں ظ۔ انصاری اور سبطِ حسن۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ظ۔ انصاری کے متعلق معلومات اور تصانیف تک رسائی خاصی دشوار ہے جب کہ سبطِ حسن کو عموماً تنظیمی کارکن اور صحافی کے طور پر جانچا جاتا ہے جب کہ ان کی ناقدانہ بصیرت بھی ترقی پسند تنقید میں اپنی ایک اہمیت رکھتی ہے۔ دسری طرف ظ۔ انصاری جو متنازعہ نقاد کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں وہ ترقی پسند تنقید کے ذہنی ارتقا اور شعور کی پختگی کی سب سے نمایاں مثال ہیں۔ لہٰذا ان دو ترقی پسند تنقید کے معماروں کا تفصیلی جائزہ اپنا ایک جواز رکھتا ہے۔

سبطِ حسن

ترقی پسند مصنفین جنھوں نے علمی اور عملی سطح پر اپنی نوجوانی سے لے کر آخر دم تک ترقی پسند تحریک سے گہری وابستگی رکھی، ان میں سیّد سبطِ حسن کا نام بہت نمایاں ہے۔ سیّد سبطِ حسن اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصّہ لکھنؤ میں گزرا۔ وہ جب علی گڑھ یونی ورسٹی سے تعلیم کی غرض سے وابستہ ہوئے تو اس وقت ان کے احباب اور معاصرین میں اختر حسین رائے پوری، خواجہ احمد عباس، اختر الایمان، اسرار الحق مجاز اور علی سردار جعفری جیسے اہلِ قلم شامل تھے۔ اُس زمانے میں ترقی پسند مصنفین کی جانب سے جو ادبی جریدہ ''نیا ادب'' کے نام سے جاری ہوا اس کا مدیر و مرتّب سبطِ حسن ہی کو بنایا گیا تھا۔

سیّد سبطِ حسن نے لکھنؤ کے بعد حیدر آباد دکن میں خاصا وقت گزارا۔ وہاں مخدوم محی الدین، قاضی عبد الغفّار، راج بہادر گوڑ، مسلم ضیائی، ابراہیم جلیس جیسے روشن خیال اور ترقی پسند ادیبوں کے ہمراہ انقلابی ادب کی بنیاد رکھی۔

سیّد سبطِ حسن نے اس کے بعد بمبئی، لاہور اور آخر میں کراچی میں زندگی کے شب و روز بسر کیے۔

سیّد سبطِ حسن افسانے یا شعر و تمثیل کے آدمی نہیں تھے، لیکن دورِ جدید میں روشن خیالی اور خرد افروزی کو تاریخی تناظر میں جس طرح سبطِ حسن نے دیکھا اور پیش کیا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کی مستقل تصانیف میں ''شہرِ نگاراں''، ''ماضی کے مزار''، ''موسیٰ سے مارکس تک''، ''پاکستان میں تہذیب کا ارتقا''، ''انقلابِ ایران''، ''مارکس اور مشرق''، ''نویدِ فکر'' اور ''پاکستان کے تہذیبی اور سیاسی مسائل'' شامل ہیں۔

سیّد سبطِ حسن ادبی صحافت سے گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ ''نیا ادب'' کے بعد انھوں نے ہفت روزہ ''لیل و نہار'' کی ادارت سنبھالی اور بعد میں خود اپنا ایک رسالہ ''پاکستانی ادب'' کے نام سے جاری کیا۔ سبطِ حسن نے عام نقادوں کی طرح اصنافِ ادب ہی کو اپنا موضوع نہیں بنایا، بلکہ تاریخ، تہذیب، فلسفہ اور علمِ بشریات کے تناظر میں خالص علمی اور فکری تصانیف پیش کیں جو اوّل تا آخر مارکسی نقطۂ نظر سے متصف ہیں۔ ان کتابوں میں بھی جگہ جگہ ادبی حوالے آئے ہیں مثلاً ''ماضی کے مزار'' میں دُنیا کی پہلی داستان ''گل گامش'' کا مکمل ترجمہ پیش کیا ہے۔ اسی طرح ''انقلابِ ایران'' جیسی کتاب میں ایران کے انقلابی شعرا کا کلام بھی پیش کیا ہے۔ قدیم مصوری اور آثارِ قدیمہ کے ذریعے انھوں نے انسانی شعور اور انسانی تہذیب کے ارتقا کو بہت شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا۔

ادب میں ترقی پسند نظریات پر سبطِ حسن نے باقاعدہ نظری مباحث کے مضامین تو تحریر نہیں کیے ہیں، لیکن ان کے علمی و ادبی مضامین میں ترقی پسندی اور اس کی وضاحت کی لہر چلتی رہتی ہے۔ جیسے وہ لکھتے ہیں:

> ترقی کا جو قانون معاشرتی زندگی پر لاگو ہوتا ہے ادب اور دوسرے فنونِ لطیفہ بھی اسی قانون کے تابع ہوتے ہیں۔ ترقی پسندی کا جو خون معاشرتی زندگی کی جان ہے وہی ادب کی رگوں میں بھی دوڑتا رہتا ہے۔[۴]

اس طرح سبطِ حسن ادب اور معاشرے کا تعلق ترقی پسندی سے قائم کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی طے کرتے ہیں کہ ادب میں جن خیالات کو فروغ دیا جائے گا وہی معاشرے میں رواج پائیں گے اور جو خیالات معاشرے میں پیدا ہوں گے ادب انھیں کی ترجمانی کرے گا۔

ترقی پسند نقادوں میں ہر نقاد نے اپنے طور پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ترقی پسندی کیا ہے اور یہ کہ نئے ادب کی تخلیق پر اصرار سے مراد اپنے کلاسیکی ادب سے بیزاری ہرگز نہیں ہے اور اس بار بار کی وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ با قاعدہ کسی انجمن اور منشور کے تحت ادب پیدا کرنے کی شعوری اور اجتماعی کوشش کا تجربہ اردو میں بالکل اپنی نوعیت کا ایک نیا اور پہلا تجربہ تھا، لہٰذا اس کے بارے میں پھیلی اور پھیلائی گئی غلط فہمیوں اور سوالات کا جواب دینا لازمی تھا۔ سبطِ حسن نے بھی اس ضمن میں وضاحت یوں کی ہے:

> وہ کون ترقی پسند ادیب ہوگا جو یہ احمقانہ دعویٰ کرے کہ کارل مارکس سے پیشتر کا سارا ادب غیر ترقی پسندانہ ہے۔ کیوں کہ ہر زمانے اور ہر زبان میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں قسم کا ادب تخلیق ہوتا رہا ہے۔ کس میں اتنی جرأت ہے جو یہ کہے کہ ہومر، ورجل، دانتے، فردوسی، سعدی، شیکسپیئر، بیدل، غالب اور نظیر اکبر آبادی وغیرہ غیر ترقی پسند تھے، اس لیے کہ انھوں نے سوشلزم کی مدح سرائی نہیں کی، یا کمیونسٹ مینی فیسٹو کو نظم نہیں کیا۔[۵]

دراصل سبطِ حسن کا یہ مضمون ''ن م راشد اور ترقی پسندی'' کے زیرِ عنوان ہے اور چوں کہ ن م راشد کو ترقی پسند ادیبوں پر اعتراضات تھے، جن کا اظہار انھوں نے اس وقت ''افکار'' کے ندیم نمبر میں ایک خط کے ذریعے کیا تھا لہٰذا سبطِ حسن نے اس مضمون کے ذریعے تمام ترقی پسند مخالفین و معترضین پر اپنے مؤقف کی وضاحت کی ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے راشد کے اس اعتراض کا بھی جواب دیا ہے کہ ''کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ادیب کو کسی خاص قسم کا ادب تخلیق کرنے کا حکم یا ہدایت دے۔''[۶]

سبطِ حسن اس ضمن میں جواب دیتے ہیں:

شخصی آزادی ہر بشر کا، خواہ وہ ادیب ہو یا غیر ادیب، پیدائشی حق ہے اس لیے کہ انسان کی تخلیقی صلاحیتوں اور طبعی میلانات کو مکمل آزادی کی فضا ہی میں فروغ مل سکتا ہے... ہمارا موقف بھی یہی ہے کہ ہر فن کار کو اپنے ''رویا'' کی بات ماننی چاہیے .... اظہارِ ذات اور تحصیلِ ذات پوری بنی نوعِ انسان کا مشترکہ حق بھی ہے اور مسئلہ بھی۔ ۷

سبطِ حسن جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں ان کا ترقی پسندانہ زاویۂ نظر اور نقطۂ نظر واضح طور پر سامنے آجاتا ہے اور وہ فن پارے اور فن کار کو انھیں اصولوں کے تحت پرکھتے ہیں جو ترقی پسند تنقید میں رائج ہیں، مثلاً:

شاعری خواہ المیہ ہو یا طربیہ یا عشقیہ، اس کا منصب ہم کو جگانا ہے نہ کہ سلانا۔ ہمارے حسّی تجربوں میں اضافہ کرنا ہے ہمارے ادراک و آگہی کی سطح کو بلند کرنا ہے۔ ہم کو زندگی کی ہر تلخ و شیریں حقیقتوں سے لذت آشنا کرنا ہے۔ ہمارے اداروں اور حوصلوں میں سوزِ یقیں کی تڑپ اور حالات کو بدلنے کا شعور پیدا کرنا ہے۔ ۸

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ سبطِ حسن ادب کی مقصدیت اور افادیت کو دیگر ترقی پسندوں کی طرح بنیادی اہمیت دیتے ہیں۔

اسی طرح صادقین کی پینٹنگز پر تبصرہ کرتے ہوئے انھیں ایک ترقی پسند رُخ سے دیکھتے ہیں اور ان خیالات کا اظہار کرتے ہیں:

یہ تصویر ان لوگوں کو دعوتِ فکر دے رہی ہے، جن کا خیال ہے کہ روشن مستقبل کی راہیں دار و رسن کے بغیر ہنستے کھیلتے طے کی جا سکتی ہیں حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ اس راہ میں قدم قدم پر بڑے سخت مقام آتے ہیں۔ تخریب کی طاقتیں ہر موڑ پہ گھات میں رہتی ہیں، ہر گام پر آرام و آسائش اور ذاتی خواہشوں اور آرزوؤں کا خون ہوتا ہے، تب بڑی جاں فشانیوں اور قربانیوں کے بعد منزلِ مراد کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔ ۹

سبطِ حسن نے ترقی پسندی اور ترقی پسند ادب کی وضاحت ہمیشہ سہل اور دوٹوک انداز میں کی ہے۔ وہ ترقی پسند ادب کی بابت یہ رائے رکھتے ہیں:

> ترقی پسند ادب کا نظامِ فکر و احساس، حسن و صداقت کی قدروں پر قائم ہے۔ درد مندی اور انسان دوستی کا شدید جذبہ، معاشرتی مسائل سے گہری دل چسپی، یہ خیال کہ ظلم اور ناانصافی کے خلاف جہاد ادیبوں کا فرضِ منصبی ہے اور یہ تصور کہ غمِ ذات اور غمِ زمانہ ایک ہی حقیقت کے دو رُخ ہیں، ترقی پسند ادب کی امتیازی خصوصیتیں ہیں۔ ترقی پسند ادیب ماضی شناس ہوتا ہے۔ ماضی کے صحت مند ادبی ورثے کو عزیز رکھتا ہے مگر ماضی پرست نہیں ہوتا نہ وہ فرسودہ روایتوں اور سماجی رویّوں پر تنقید کرنے سے گریز کرتا ہے۔[۱۰]

سبطِ حسن کے مضامین سے، خصوصاً اقبال کے حوالے سے ان کی آرا میں نمایاں تبدیلی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بھی ذہنی ارتقا کے اس مرحلے سے گزرے جہاں جذباتیت سے نکل کر ادیب اور نقاد غور و فکر سے نتائج اخذ کرنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ طے ہے کہ ان دونوں مراحل میں سبطِ حسن خالص ترقی پسندانہ فکر کے نمائندے رہے اور اس کا سبب ان کا یہ احساس ہے:

> ہر دور کی اپنی سچائیاں اور برائیاں ہوتی ہیں جو فن کار کے جذبات و احساسات کے تاروں کو چھیڑتی رہتی ہیں اور مبارک ہیں وہ فن کار جو ان سچائیوں کو اپناتے ہیں اور برائیوں کی زرتار نقابوں کو پارہ پارہ کر دیتے ہیں۔[۱۱]

سیّد سبطِ حسن نے اپنے ادبی مضامین میں زبانوں کے مسئلے، ترقی پسند اور جدیدیت، تانیثیت کی تحریک، اقبال اور روشن خیالی جیسے موضوعات کے علاوہ بچوں کے ادب، برعظیم میں روشن خیالی اور رواداری کی متصوفانہ روایت، سیکولرازم اور سوشلزم پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ لہٰذا ہم سبطِ حسن کو خرد افروز، روشن خیال ادیب، صحافی کے طور پر ترقی پسند نقادوں میں اہم جگہ دیں گے جن کے افکار و خیالات عالمی تہذیب و تمدن، سماج اور موجودہ دور کے علمی و سائنسی حقائق سے مربوط ہیں۔

ظ۔ انصاری

ظ۔ انصاری کا پورا نام سیّد ظلِ حسنین نقوی تھا۔ وہ ۴۔ فروری ۱۹۲۵ء کو سہارن پور میں پیدا

ہوئے۔انھیں ادبی دُنیا ایک مترجم، مدّرس، محقق، زبان داں، صحافی، اردو کے صاحبِ اسلوب نثر نگار اور روسی زبان و ادب کے معلّم کی حیثیت سے جانتی ہے۔ ظ۔ انصاری کی تعلیم و تربیت کلاسیکی اور جدید علوم کی تحصیل سے تعلق رکھتی ہے۔ بمبئی کے قیام کے دوران وہ سوشلسٹ نظریات اور تحریک سے ہم رشتہ ہوئے۔ انھوں نے امیر خسرو، غالب اور اقبال پر سیر حاصل کام کیا ہے۔ ان کا قیام خاصے طویل عرصے تک روس میں رہا جس سے ان کی ترقی پسندانہ آگہی میں اضافہ ہوا۔ ان کی چند اہم تصانیف کے نام یہ ہیں:

''برنارڈ شا''، ''غالب شناسی''، ''چیخوف''، ''پوشکن''، ''خسرو کا ذہنی سفر''، ''اقبال کی تلاش''، ''کتاب شناسی''، ''کانٹوں کی زبان'' اور ''زبان و بیان''۔

انھوں نے اردو اور روسی زبانوں کے لیے لغت نگاری کا بھی کام کیا۔ ''کانٹوں کی زبان'' ان کے اداریوں اور تبصروں کا مجموعہ ہے۔ ان کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ادب کے ساتھ ساتھ عالمی سیاست پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ ظ۔ انصاری نے غالب اور اقبال کا بہت گہرائی میں مطالعہ کیا اور بعض ایسے زاویے اجاگر کیے جو ان سے پہلے ناقدین کی نظروں سے اوجھل رہے، مثلاً غالب کی مثنوی ''ابرِ گوہر بار'' پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے انھوں نے اقبال پر غالب کے اثرات کو ایک نئے تناظر میں پیش کیا ہے۔ ظ۔ انصاری اگر چہ غالب کے ''طرفدار'' نظر آتے ہیں لیکن غالب نے غدر کے جو حالات تحریر کیے ہیں ان کا تجزیہ ظ۔ انصاری نے معروضی انداز میں کیا ہے جس سے غالب شناسی کی تازہ ہوا آتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

اسی طرح ظ۔ انصاری نے ''غالب شناسی۔۲'' میں جہاں عمدگی سے غالب کا اردو فارسی کلام منتخب کیا ہے وہیں اس کے آغاز میں ''غالب شناسی کے زینے'' کے زیرِ عنوان غالب کے شعر و فن کا تفصیلی جائزہ بھی پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ غالب تفکر کے قائل ہیں علومِ معقولات (Natural Sciences) کی تحصیل پر اصرار کرتے ہیں، ہر منظر کا بغور مشاہدہ کرنے اور اس کی تہہ میں اترنے کو ذہنی آدمی (Intellectual) کا فریضہ قرار دیتے ہیں لیکن ان کا نقطۂ نظر عملی ہے۔ یہ عملی نقطۂ نظر غالب کی نظم و نثر میں جو غیر معمولی خصوصیات ابھارتا ہے انھیں ظ۔ انصاری نے تفصیل سے بیان کیا ہے، جو کچھ یوں ہیں:

۱۔ وہ انتہائی غم اور زبردست نشاط کے لمحوں میں بھی ہوش مندی سے ہاتھ نہیں دھوتا، ہر موقع پر لیے دیے رہتا ہے۔

۲۔ دُنیا کے کئی عظیم شاعروں کی طرح غالب کی شاعری بھی ایک تاریخی دور کا موڑ دکھاتی ہے۔

۳۔ فارسی اردو شاعری کے ایک ہزار سالہ ادبی ورثے میں غالب سے بڑھ کر کسی نے ''عقلیت'' پر اتنا زور نہیں دیا۔

۴۔ غالب نے اپنے زمانے میں رائج تصوف کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ تصوف کے مختلف نظریات، اصطلاحات اور مسائل پر غالب کی بہت گہری نظر تھی۔

۵۔ تصوف کی جس روح کو شاعر نے اپنایا، وہ مخلوق کو خالق کا پرتو مان کر بھی فرد کی قدر و قیمت سے آگاہ ہے۔

۶۔ غالب اپنے اردگرد کی دُنیا کو ہی نہیں، خود اپنے عمل کو بھی تنقید کی کسوٹی پر رکھتا ہے۔

۷۔ غالب نے انفرادیت، تشکیک اور فرد کی تنہائی کو جو ادبی لہجہ عطا کیا اس کے سبب اُسے عہدِ حاضر کا شاعر کہا جا رہا ہے۔ غالب کی شاعری انسان کو اس کے پھیلاؤ یا حدِ نظر میں افق تا افق ہی نہیں دیکھتی بلکہ اس کی گہرائی میں بھی اترتی ہے۔ تینوں فاصلوں (Three Dimensions) میں آدمی کے وجود اور مسائل کی تلاش جو بڑی شاعری کا وصف ہے، غالب کے ہاں بہت نمایاں ہے۔

اس خصوصیت میں ظ۔ انصاری غالب کو خیام اور حافظ سے آگے مانتے ہیں۔

۸۔ غالب کے کلام کا بڑا حصّہ ایسا ہے جس میں ''اُداسی'' یا ''درد'' کو اتنا ہی پایا جاسکتا ہے جتنا مسرت اور شگفتگی کو۔

۹۔ غالب کے کلام میں ''صوتی آہنگ'' لفظی حسن اور آوازوں کا ایسا نگار خانہ سجا ہوا ہے جس کی طرف حال میں توجہ کی گئی ہے۔

۱۰۔ لفظوں کی تراش اور مصرعوں کی مجموعی آواز میں بھی غالب ایک اعلیٰ درجے کا فن کار نظر آتا ہے۔[۱۲]

غالب شناسی میں ظ۔ انصاری کا یہ تجزیاتی مقالہ یقیناً خاص اہمیت کا حامل ہے اور اس تمام بحث کے بعد وہ غالب کی مقبولیت کا راز یوں بیان کرتے ہیں:

غالب کی مقبولیت کا راز اس کی فنّی بصیرت میں ہے اور فنی بصیرت کے اسرار

قدیم وجدید کی آویزش وآمیزش میں تہہ در تہہ چلے گئے ہیں۔ غالب نے ''کیا معنی آفرینی اور کیا لفظ تراشی'' دونوں سمتوں فارسی اردو کی ادبی وراثت پر ردو قبول کا بے رحم عمل کیا ہے اور ردو قبول کے اس بے رحمانہ عمل نے ہی اس کی شاعری کو توانائی اور تازگی بخشی ہے۔[۱۳]

ظ۔ انصاری کا غالب پر ایسا تجزیہ پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ وہی ظ۔ انصاری ہیں جنھوں نے غزل کے خلاف ''غزل باقی رہے گی'' جیسا متنازعہ مضمون تحریر کیا تھا جو ''ادبِ لطیف'' لاہور میں شایع ہوا تھا۔ اس مضمون میں ظ۔ انصاری نے غزل کو جاگیرداری کی باقیات قرار دیتے ہوئے رد کر دیا تھا اور حافظ کو رجعت پسند قرار دیا تھا اور اسی مضمون کے ردِ عمل میں سجاد ظہیر کی ''ذکرِ حافظ'' جیسی کتاب اور ممتاز حسین کا ''کچھ ماضی کے ادبِ عالیہ سے متعلق'' جیسا مقالہ اردو کے قابلِ قدر ادبی سرمائے کا حصہ بنے۔ اس تبدیلی سے ظ۔ انصاری کا ذہنی ارتقا اور اُن کے ناقدانہ شعور کی پختگی سامنے آتی ہے۔

ظ۔ انصاری نے اقبال کو بھی اپنی تنقید میں خاص اہمیت دی ہے اور اقبال کے متعلق بعض ترقی پسندوں کے ناروا سلوک اور اقبال کی عظمت کو یوں اجاگر کیا ہے:

> خاص کمیونسٹ حلقوں میں اقبال پر کتنی ہی نکتہ چینی ہوتی رہی مگر ترقی پسند شاعری اور شاعروں کو اس کے سوا چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اقبال سے فیض اٹھائیں۔ ان کے مردانہ اور پرسوز ترنم سے سیاسی مسائل کے بے باکانہ بیان میں رجز کی شان سے، رزمیہ فضا کے آکسیجن سے اپنا چراغ جلائیں اور ٹھیک اسی طرح ادھوری تاویلیں کر کے اپنی طرف کھینچیں۔ جیسے خود اقبال نے ''بالشویزیم'' کو اپنی طرف کھینچا تھا۔ اقبال کے قبولِ عام میں اس بات کو بھی دخل ہے کہ ترقی پسند شاعری کا اچھا، برا قابلِ ذکر حصہ اس ''زندہ رود'' سے اپنی پیاس بجھاتا رہا ہے۔[۱۴]

عام طور پر ترقی پسند نقادوں نے تحقیق کا وہ راستہ اختیار نہیں کیا جو مثلاً قاضی عبدالودود، امتیاز علی خاں عرشی، مالک رام وغیرہ کے یہاں نظر آتا ہے اور زیادہ تر تنقید کو اصولی، نظریاتی اور سماجی تناظر تک محدود رکھا۔ البتہ پروفیسر ممتاز حسین اور ظ۔ انصاری دو ایسے ترقی پسند نقاد ہیں جنھوں نے خصوصیت کے ساتھ امیر خسرو پر دیدہ ریزی سے تحقیق کی اور متعدد ایسی روایات کی صحت کی جانچ پڑتال کی جو امیر خسرو کے باب میں رواج پا چکی تھیں۔ پھر چوں کہ ظ۔ انصاری کو فارسی زبان پر بھی

عبور تھا اس لیے انھوں نے خسرو کی بعض ادق اور مشکل تصانیف کا بھی مطالعہ کیا۔

ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ساتھ ساتھ انگریزی، فارسی، عربی نیز انگریزی اور روسی زبانوں سے واقفیت کی بنا پر ظ۔ انصاری نے امیر خسرو کی تحریروں کا لسانی جائزہ بھی مختلف انداز میں لیا ہے۔ اس طرح وہ الفاظ جو برج، کھڑی بولی، ملتانی اور پنجابی سے تعلق رکھتے ہیں ان کا مطالعہ بھی اپنی تحریروں میں شامل کیا ہے۔ لہٰذا نہ صرف سات سو سال پہلے کے امیر خسرو کے اسالیب پر روشنی پڑتی ہے بلکہ اردو کی ارتقائی تاریخ بھی تحقیق کی روشنی میں زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔

جیسا کہ سطورِ بالا میں کہا جا چکا ہے کہ ظ۔ انصاری صاحبِ اسلوب نثر نگار ہیں تو اس اسلوب کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

> امیر خسرو ۲۷ برس جیے، عمر بھر حرکت میں رہے۔ ہندوستان کے چاروں کھونٹ گھومے پھرے، زمینوں اور زبانوں کی سیر کی، ان کے ضمیر میں اترے۔ سامنے کے منظر کی چادر سرکا کر اپنے زمانے کی تہہ و بالا حقیقتوں کو چھو کر، برت کر دیکھا، اپنی نظم و نثر میں ہمیں دکھایا۔ جو دکھایا وہ آج سات صدی پار بھی پرانا یا از کار رفتہ نہیں ہوا۔ اسی سے ہمارا رشتہ کہیں اتنا دھندلا ہے اور کہیں کھلا کھلا جتنا اپنے آباؤ اجداد سے، اُن کے آباؤ اجداد سے، گنگا اور ہمالیہ سے۔ ماہ و سال نے تقویم پلٹی، کیلنڈر بدلے، معاملات اور واقعات کی سطح بدلی، اصطلاحیں بدلیں، استعارے بدلے، ادارے بدلے۔۔ لیکن ارادے نہیں بدلے گئے۔ ارادوں کو یکسر بدل ڈالنے کا سلسلۂ عمل جیسے تیسے، چل تو رہا ہے تاہم تہذیبِ حاضر کے بس میں نہیں اس کی تکمیل۔ تلاطم اور تصادم میں، نت نئی آگاہی کی رفتار کے ساتھ تیزی ہی آئی ہے، کمی نہیں آئی۔[۱۵]

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ترقی پسند تنقید کے معماروں کے سامنے ایک اہم ذمہ داری یہ بھی تھی کہ وہ ترقی پسند نظریے، ادب، ادیب اور اصولِ نقد کی وضاحت کریں، ظ۔ انصاری نے اس ضمن میں ''مارکسی تعلیم کا سلسلہ''، ''مارکس، اینگلس کی نادر تحریریں''، ''سوویت یونین کی تاریخ'' جیسی کتابوں کا ترجمہ کر کے مارکسزم اور ترقی پسندی کی تفہیم کا ایک مختلف طریقہ اختیار کیا ہے۔

☆☆☆☆

حواشی/حوالہ جات

۱۔ قمر رئیس، ڈاکٹر، ۱۹۹۴ء، ''مارکسی تنقید: رُجحان اور رویے'' مشمولہ ''ترقی پسند ادب پچاس سالہ سفر''، مرتبہ قمر رئیس، سید عاشور کاظمی، دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، ص۔ ۵۷۰۔

۲۔ ایضاً، ص۔۵۷۲

۳۔ ایضاً

۴۔ سبطِ حسن، ۲۰۱۲ء، ''ادب اور روشن خیالی''، مرتبہ: ڈاکٹر سید جعفر احمد، کراچی، مکتبۂ دانیال، ص۱۰۲

۵۔ ایضاً، ص۔۱۰۶

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً، ص۔۱۰۹

۸۔ ایضاً، ص۔۱۳۳

۹۔ ایضاً، ص۔۱۲۰

۱۰۔ سبطِ حسن، ۱۹۸۶ء، ''نقطۂ نظر''، عابد حسن منٹو، (تعارف)، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ص ن

۱۱۔ سبطِ حسن، ۲۰۱۲ء، ''ادب اور روشن خیالی''، مرتبہ: ڈاکٹر سیّد جعفر احمد کراچی: مکتبۂ دانیال ص۔۱۲۱

۱۲۔ ظ۔ انصاری، ۱۹۷۰ء، ''غالب شناسی۔۲''، بمبئی: لیڈر پریس، ص ۷ تا ۳۰

۱۳۔ ایضاً، ص۔۳۰

۱۴۔ ظ۔ انصاری، س ن، ''اقبال کی تلاش میں''، ص۔۱۷

۱۵۔ ظ۔ انصاری، ۱۹۸۸ء، ''خسرو کا ذہنی سفر''، دہلی: انجمن ترقیِ اردو ہند، ص ن (دیباچہ)